R. No 2120/61. Regd. No A. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 39

Telegrams "ANJUMAN"

جلد ۲۰ - شمارہ ۲۳ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۱۵ر جون سنہ ۱۹۶۱ء

رئیس مینائی (بنگلور)

منشی نوبت رائے نظرؔ

(صحافتی زندگی کے بعض پہلو!)

یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ اُردو زبان کے رنگ روپ کو نکھارنے اس کے خدوخال کو سنوارنے اس کی ترویج و توسیع اور اس کی تہذیب و تشکیل میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جد وجہد کارفرما رہی ہے یہ واقعہ ہے اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ انھیں دونوں قوموں کے ملاپ سے یہ زبان وجود میں آئی اور بتدریج اپنے ارتقاء کی منزلیں طے کیں اور انھیں دونوں قوموں کے سایۂ عاطفت میں یہ پروان چڑھی۔

بقول ڈاکٹر عبدالحق :-

"اگر ہندوؤں کی اس میں شرکت نہ ہوتی تو یہ وجود ہی میں نہیں آسکتی تھی"

اس مضمون سے میرا مقصود صرف منشی نوبت رائے نظرؔ کی صحافتی زندگی کے بعض پہلوؤں کو اُجاگر کرنا ہے۔

"منشی نوبت رائے نظرؔ ایک معزز اور شریف خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان کے آبا و اجداد نے اپنے وقت میں علم و ادب میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ نظرؔ چونکہ بچپن ہی سے غیر معمولی ذہانت اور استعداد لے کر پیدا ہوئے تھے" اس کے علاوہ خود لکھنؤ کا ماحول اور اس کی فضا بڑی سازگار تھی۔ اس لئے تھوڑے ہی عرصے میں اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا انھیں اچھا موقع ہاتھ آگیا اور ہمہ تن شعر و شاعری میں منہمک ہو گئے۔ ان کا یہ انہماک و شغل تا دمِ مرگ قائم رہا اور یہ حقیقت بھی ہے کہ پرورشِ لوح و قلم کے علاوہ ایک ادیب و شاعر کا ذریعۂ معاش اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ ۱۸۹۷ء میں انھوں نے اپنا مشہور رسالہ "خدنگِ نظر"[1] جاری کیا۔ اس کے سن اجرا میں تمام تذکرہ نگار متفق ہیں۔ البتہ یہ رسالہ کب بند ہوا اس میں اختلاف ہے۔ رام بابو سکسینہ ایم۔ اے نے لکھا ہے :-

"یہ رسالہ تھوڑے عرصہ رہا یعنی ۱۹۰۰ء میں بند ہوا لیکن جاری رہ کر بند ہو گیا"

لیکن جگر بریلوی "یادِ رفتگاں" میں رقم طراز ہیں :-

"۱۸۹۷ء میں انھوں نے اپنا مشہور رسالہ "خدنگِ نظر" نکالا جو سات سال بعد مالی مشکلات کے باعث بند کرنا پڑا"

مذکورۂ بالا بیانوں کے مطابق یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رام بابو سکسینہ نے "خدنگِ نظر" کی مدت صرف تین سال بتائی ہے اور ۱۹۰۰ء کے بعد اس کا بند ہو جانا سنِ مذکور سے ثابت کیا ہے، لیکن نوبت رائے نظرؔ کا

---

[1] "خدنگِ نظر" پیامِ یار کے بعد لکھنؤ کا سب سے قدیم اور مشہور گلدستہ تھا۔ اس کی اشاعت اصفی پریس نوازگنج لکھنؤ سے ہوتی تھی اور نظام سابق میر محبوب علی خاں مرحوم کے نام نامی کے ساتھ معنون تھا۔ -- ۱۲

(بحوالۂ ضمیمۂ تاریخ ادبِ اُردو)

۱۹۰۰ء سے "خدنگِ نظر" میں نثری مضامین کا مستقل الحاق ہو گیا تھا۔ اس کے سوا برس بعد اپریل ۱۹۰۱ء میں لاہور سے "مخزن" شائع ہوا، اور جو کمی "خدنگِ نظر" میں باقی رہ گئی تھی وہ شیخ صاحب کی نکتہ رس نگاہ اور اعلیٰ ذہانت نے پوری کر دی۔ "خدنگِ نظر" نے اپنی زندگی میں اُردو رسالوں کو دو مفید تحفے دیے تھے ایک عمدہ لکھائی چھپائی دوسرا نثر و نظم کا مستقل الحاق جو اس سے پیشتر مفقود تھے "مخزن" نے ان چیزوں کو نہایت اعلیٰ پیمانے پر پیش کیا اور اس طرح ادبی دنیا کی ترقی شروع ہوئی۔ اس کے بعد بہت سے رسالے نکلے مگر وہ "مخزن" کی کوشش پر کوئی اضافہ نہ کرسکے"

(بحوالۂ رسالہ "ادیب" بابت ماہ جون ۱۹۱۰ء)

یہ بیان (رسالۂ "ادیب" بابت ماہ جون ۱۹۱۰ء صفحہ ۳۰) مصنف "تاریخ ادب اُردو" کے مذکورہ قول کی تردید کرتا ہے۔

"اس (خدنگ نظر) میں محض ہم طرح غزلیات ہی نہیں ہوتی تھیں بلکہ اس کے پہلے نمبر میں جو ستمبر ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا تھا ایک قصیدہ، چند قطعات اور ایک نثر مضمون بھی شامل تھا، عرصے تک اس قسم کی ناکام کوششوں کے بعد جنوری ۱۹۰۱ء سے اس کے ساتھ نثر مضامین کا مستقل سلسلہ شروع ہو گیا۔"

اس بیان سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ ۱۹۰۱ء کے بعد بھی "خدنگ نظر" جاری رہا۔ "خدنگ نظر" کے ٹائٹل پر پہلے یہ شعر ہوتا تھا۔

افسوس ہیں اگر نگہہ قصد کرے آپ ● پہلا ہی دل کو تیر "خدنگ نظر" سے بچائے

کچھ عرصہ کے بعد یہ شعر دیا جانے لگا۔

نکلا[۱] ہے بن سنور کے "خدنگ نظر" نظر ● یاں دل دھڑک رہا ہے کسی کی نظر نہ ہو

جگر بریلوی نے لکھا ہے:۔

"خدنگ نظر میں ابتداءً غزلیں ہی شائع ہوتی تھیں جن کے لئے خاص طور سے مشاعرے منعقد کئے جاتے تھے (..........) (..........) کچھ دنوں بعد خدنگ نظر میں مضامین نثر کا بھی اضافہ ہونے لگا۔"

اور رام بابو سکسینہ رقمطراز ہیں:۔

"خدنگ نظر" شروع میں تو مجموعۂ غزلیات ہوتا تھا اگرچہ کچھ نثر کے مضامین بھی اس میں شامل ہوتے تھے۔ شاعری میں آغا مظہر لکھنوی سے تلمذ تھا جن کی کوشش سے مشاعرے منعقد ہوتے تھے اور انھیں مشاعروں کی غزلیں "خدنگ نظر" میں درج ہوتی تھیں۔"

دونوں حضرات کے مذکورہ بیانوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ "خدنگ نظر" شروع میں غزلیات کا مجموعہ تھا مگر بعض شواہد و قرائن اس کی تردید کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو رسالۂ "ادیب" کا اڈیٹوریل بابت ماہ جون ۱۹۱۰ء صفحہ ۳۰ نظر رقم طراز ہیں:۔

"منشی صاحب ہمارے بہت پرانے کرم فرما ہیں اور "ادیب" کے علاوہ ہماری ادبی کوششوں کو "خدنگ نظر" کے صفحوں پر بھی دیکھ چکے ہیں چنانچہ ممدوح نے "ادیب" پہ ریویو کرتے ہوئے مرحوم "خدنگ" کو بھی یاد فرمایا ہے اور اسے ایک "پُرلطف گلدستہ" کا خطاب دیا ہے۔ درحقیقت وہ ایک گلدستہ تھا لیکن عام گلدستوں کی طرح اس میں محض ہم طرح غزلیات ہی نہیں ہوتی تھیں بلکہ اس کے پہلے ہی نمبر میں جو ستمبر ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا تھا، ایک قصیدہ، چند قطعات اور ایک نثر مضمون بھی شامل تھا۔ عرصہ تک اس قسم کی ناکام کوششوں کے بعد جنوری ۱۹۰۱ء سے اس کے ساتھ نثر مضامین کا مستقل سلسلہ شروع ہو گیا تھا جن میں نثر مضمون ملک کے مشہور ادیب و نگار مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر کے قلم سے لئے جاتے تھے نیز بعض نیچرل مذاق کی نظمیں بھی جن کا زیادہ حصہ ہمارے نامور دوست منشی نادر علی صاحب نادر کے زورِ تخیل کا نتیجہ ہوتا تھا۔"

[۱] "یادرفتگاں" میں مذکورہ بالا شعر کا مصرعۂ اولیٰ بادنیٰ تصرف یوں درج ہے۔
"نکلا ہے بن سنور کے "خدنگ نظر" رہ ہو"

"خدنگ نظر" اور اس کے اختلاف مدت سے قطع نظر نظر نے کئی اور علمی ادبی رسالوں کی ادارت کی ملاحظہ ہو:۔

"۱۹۰۵ء میں منشی دیانرائن نگم آنجہانی اڈیٹر رسالۂ "زمانہ" نے آپ کو کانپور بلایا اور "زمانہ" کے اسٹاف میں شامل کر لیا۔ ۱۹۱۰ء میں انڈین پریس الہ آباد کی طلبی پر الہ آباد گئے اور وہاں سے "ادیب" کا اجرا کیا۔ اس کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ (رسالۂ "ادیب" کی پہلی جلد جنوری ۱۹۱۰ء لغایت ماہ جون ۱۹۱۰ء کی ایک فائل اور دوسری جلد ماہ جولائی ۱۹۱۰ء کا ایک شمارہ مسلم لائبریری بنگلور میں موجود ہے) ۱۹۱۱ء میں "ادیب" سے قطع تعلق کے بعد نظر لکھنؤ چلے گئے کچھ دنوں بعد پھر کانپور آ کر "زمانہ" کے اسٹاف میں دوبارہ شامل ہو گئے اور "ہفتہ وار آزاد" ان کی نگرانی میں نکلنے لگا۔ (یہ "زمانہ" کے دفتر سے ہفتہ وار نکلتا تھا) تقریباً دو سال تک کانپور میں رہے پھر ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ آ گئے اور مسٹر حامد علی خاں بیرسٹر مرحوم کی وساطت سے رائے بہادر منشی پراگ نرائن بھارگو مالک مطبع نولکشور پریس "اودھ اخبار" کی قدردانی سے اخبار "تفریح" کی ادارت آپ کے سپرد ہوئی۔ تھوڑے دنوں بعد لکھنؤ کے سب سے قدیم اور مشہور "اودھ اخبار" کی ادارت بھی آپ کو سونپی گئی ۔۔۔!

بقول مصنفین "یادرفتگاں" و "تاریخ ادب اُردو"

"اودھ اخبار" میں آپ نے اس قدر تن دہی جانفشانی محنت اور دماغ سوزی سے کام لیا کہ آپ کی صحت خراب ہو گئی۔"

اور مزید براں خانگی صدمے و سانحے اور ہجوم افکار جن کی وجہ سے نظر نے اپنا تعلق "اودھ اخبار" سے بھی قطع کر لیا اس کے بعد پنڈت برج ناتھ شرغا ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کی تحریک سے اخبار "خادم ہند" سے وابستہ ہو گئے (غالباً ۱۹۱۵ء میں) جو امن سبھا کی طرف سے نکلتا تھا ۔۔۔

"یادرفتگاں" میں جگر بریلوی لکھتے ہیں:۔

"نظر نے اس پرچہ کو پسندیدہ اور معتبر پرچہ بنا دیا لیکن یہ اخبار آپ کی قابلیتوں کے اظہار کے لئے تنگ اور نامناسب میدان تھا اہل ملک جانتے ہیں امن سبھا کس ڈھنگ کا نام تھا اس کے عیبوں کو چھپانے کے لئے نظر کو آزادی تحریر کا کتنا خون کرنا پڑا ہوگا اور طبیعت کے قدرتی بہاؤ کو کس قدر دبانا اور بدلنا پڑا ہوگا۔"

غرضیکہ یہ مضمون منشی نوبت رائے نظر کی صحافتی زندگی کا ایک اجمالی خاکہ ہے ۔۔۔! ورنہ!!

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار ● گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

بقول جگر بریلوی:۔

"جتنے اخبار اور رسالے آپ کی ادارت میں نکلے سب کی کایا پلٹ دی اور ایسا سنوارا کہ ادبی تہذیب کا نمونہ بن گئے۔ "رسالہ ادیب" نے تو وہ معیار پیش کیا جو رسالہ کا نصب العین ہے۔"

بشرط فرصت آئندہ رسالہ "ادیب" کی اپنے معاصرین پر فوقیت اس کی افادیت و اہمیت اور اس کی اہم نگارشات و مندرجات پر ایک مقالہ "ہدیۂ ناظرین" کیا جائے گا۔

ہماری زبان

۱۵ جون ۱۹۶۱ء

دینا وہ اُس کا ساغرِ مے یاد ہے نظامؔ
منہ پھیر کر اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

یو-پی کے بڑے وزیر جناب چندر بھان گپتا نے دو مہینے ہوئے ودھان پریشد میں کہا تھا کہ اُردو دوستوں کو جو شکایات ہیں اور حکومت کی پالیسی پر عمل کرنے میں افسروں سے جو کوتاہیاں ہوئی ہیں، اُن کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی بنائیں گے۔ اخباروں سے معلوم ہوا کہ اب اس کمیٹی کا ایک خاص گزٹ کے ذریعے سے اعلان ہو گیا ہے اور اس کے ذمے جو کام ہیں اُن کی صراحت کر دی گئی ہے۔

کمیٹی کے صدر آچاریہ کرپلانی ہیں۔ ممبروں کے نام یہ ہیں:-

مولانا حفظ الرحمٰن، حیات اللہ انصاری، بشیر حسین زیدی، سورت نراین مانی ترپاٹھی، صادق علی، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر دین دیال گپتا، ڈاکٹر دھریندر ورما، ڈاکٹر بابو رام سکسینہ، شری نراین چترویدی، محمد میاں فاروقی، عبدالماجد دریابادی، امرت رائے، محمد میاں اور ساغر نظامی۔

سب سے پہلے کمیٹی کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ کوئی ایسی سفارش نہ کرے جس سے ہندی کی اُس پوزیشن پر اثر پڑے جو اُسے ریاست کی سرکاری زبان اور یونین کی سرکاری زبان کی حیثیت سے حاصل ہے۔ اس کے بعد اس کے ذمے یہ کام سونپے گئے ہیں:-

اوّل۔ اُردو کی ترقی کے لئے ریاست کی موجودہ اسکیموں کا جائزہ لینا اور اس سلسلے میں سفارشات کرنا۔

دوم۔ ریاستی حکومت نے اُردو کے انتظامی امور میں استعمال کے لئے مختلف اوقات میں جو احکام جاری کئے ہیں اُن پر عمل کا جائزہ لینا اور حسبِ ضرورت اس سلسلے میں مشورہ دینا۔

سوم۔ لسانی اقلیتوں کے لئے منظور شدہ دستوری تحفظات کے سلسلے میں پیدا ہونے والے اُن مسائل پر غور کرنا جو تعلیمی دائرے میں آتے ہیں اور حکومت سے مناسب سفارشات کرنا۔

چہارم۔ نیز اُردو اور لسانی اقلیتوں کے لئے تحفظات کے ذیل میں جو بھی مسائل آتے ہوں اور اُن کو کمیٹی کے کام کے سلسلے میں لیا جا سکتا ہو، اُن کے بارے میں بھی اپنی سفارشات پیش کرنا۔

کمیٹی کا دفتر لکھنؤ میں ہوگا اور اسے چھ مہینے کے اندر رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ یو-پی کی حکومت اُردو دوستوں کی شکایات پر توجہ کر رہی ہے اور چاہتی ہے کہ انھیں دور کرے۔ امید ہے کہ کمیٹی جلد اپنا کام شروع کر دے گی اور مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے ایسی رپورٹ حکومت کے سامنے پیش کرے گی جو اُردو دوستوں کو مطمئن کر سکے اور جس کے ذریعے سے اس ریاست میں اُردو کو اس کا جائز مقام مل سکے۔

اس سلسلے میں ہم دو باتوں کی طرف حکومت یو-پی کو توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ اوّل تو ڈاکٹر بی-سی رائے کے اس اعلان کی طرف جو اُنھوں نے آسام کے حالات سے متاثر ہو کر حال میں کیا ہے اور جس میں اس پر زور دیا ہے کہ جن ریاستوں میں اقلیتوں کی قابلِ لحاظ آبادی ہو وہاں اقلیت کی زبان کو بھی سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے، دوسرے اس بات کی طرف کہ آخر ایک ایسی کمیٹی میں جو لسانی اقلیتوں کے لئے مناسب تحفظات اور اُردو کے بارے میں حکومت کی پالیسی پر عمل کی جانچ کے لئے بنائی گئی ہے، ہندی کے اتنے نمائندے رکھنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ اس بات پر بھی زور دینے کی چنداں ضرورت نہ تھی کہ کمیٹی کی سفارشات ریاست میں ہندی کی پوزیشن کو کمزور نہ کریں۔ ہندی کی پوزیشن مستحکم ہے۔ ریاست کی اکثریت ہو یا اقلیت، کسی کو اس پر اعتراض نہیں ہے، اور نہ ہو سکتا ہے کہ ہندی ریاست کی سرکاری زبان کیوں ہے۔ یہ ہندی کا حق تھا جو اسے ملا ہے اور اسے سب مانتے ہیں۔ اگر اردو کا حق اُسے دیا جاتا ہے یا کسی اقلیت کی زبان کے استعمال کے لئے سہولتیں دی جاتی ہیں تو اس سے ہندی کی پوزیشن کیسے مجروح ہو سکتی ہے۔ اس وضاحت سے اور ہندی کے اتنی بڑی تعداد میں نمائندے شامل کرنے سے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اُردو دوستوں کی شکایات دور کرنے سے زیادہ حکومت کو ہندی کی پوزیشن کا خیال ہے۔ خدا کرے کہ یہ اندیشہ غلط ہو۔

آخر ہندی کے اتنے نمائندے اس کمیٹی کے لئے کس طرح مفید ہوں گے۔ ایک پرانی مثل ہے، جس کی نہ ہو پھٹی بوائی، وہ کیا جانے پیر پرائی۔ ہندی کے ان ودوانوں اور پنڈتوں کو اُردو والوں کے درد کا کیا علم ہوگا۔ انھیں تو یہی فکر رہے گی کہ جیسے وہ ہشیلی کہہ کر ٹال دیا کرتے ہیں، اُسے زبان کی حیثیت سے تسلیم کرنے کا سوال نہ آنے پائے۔ پھر بھی ہمیں امید ہے کہ آچاریہ کرپلانی، جو کمیٹی کے صدر ہیں، اصل مسئلے پر پوری توجہ کریں گے اور کمیٹی کی سفارشات اُردو کو اس کے گھر میں اس کا جائز مقام دلانے کا باعث ہوں گی۔

اِدھر اُدھر سے

اُردو کی نمایاں خدمات پر ساہتیہ اکیڈمی آندھرا کے تین انعامات
اُردو انسائیکلو پیڈیا کی اشاعت
منتخب تلگو شاعری کا اُردو میں ترجمہ

ساہتیہ اکیڈمی آندھرا پردیش نے اُردو زبان اور ادب کی خدمات کے صلے میں پانچ پانچ سو روپے کے تین انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ پارلیمنٹ کے رکن اور اکیڈمی کے صدر ڈی راما نج راؤ نے اعلان کرتے ہوئے بتایا کہ یہ انعامات جناب واسدیو ایڈیٹر روزنامہ "مشیر دکن" جناب بنارسی داس سکسینہ اور حمید الرزاق بسمل کو دئے جائیں گے۔

جناب واسدیو راؤ کو یہ انعام اُردو زبان کی نمایاں خدمت انجام دینے کے صلے میں دیا جارہا ہے۔ روزنامہ مشیر دکن گذشتہ ۷۰ سال سے نکل رہا ہے اور سارے ہندستان میں اُردو کا قدیم ترین روزنامہ ہے۔

جناب سکسینہ نے کتابوں و رسائل وغیرہ کا ایک بہترین ذخیرہ جمع کیا ہے اور جناب بسمل اُردو کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔

آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی کی اُردو کمیٹی کا ایک جلسہ حبیب الرحمن خاں کی صدارت میں ہوا جس میں یہ طے کیا گیا کہ اُردو انسائیکلو پیڈیا شائع کیا جائے۔ ابتدائی کاموں کے لئے حبیب الرحمن، مخدوم محی الدین اور عابد علی خاں پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ توقع ہے کہ مجوزہ انسائیکلوپیڈیا کی پہلی جلد ایک سال کے اندر شائع ہو جائے گی۔ اکیڈمی نے یہ بھی طے کیا کہ منتخب تلگو کلام کا اُردو میں ترجمہ کیا جائے۔ ترجمہ کا کام مخدوم محی الدین اور راما نج راؤ انجام دیں گے۔ یہ کتاب جلد ہی شائع ہو جائے گی۔

"آج کا کشمیر"

ازبکستان کی سائنس اکادمی کے ادارہ علوم شرقیہ نے حال ہی میں کشمیر کی تاریخ معاشیات اور کلچر کے بارے میں ایک کتاب شائع کی ہے۔ کتاب کا نام ہے "آج کا کشمیر" اور اس کے مصنف ہیں کستوف۔

مصنف نے سوویت قاری کو کشمیر کی تاریخ و معاشیات کے اہم ادوار سے اور اس کے بے مثال اور دلپذیر کلچر سے روشناس کرایا ہے۔ ہندستانی، سوویت اور دوسرے ذرائع کی بنیاد پر مصنف نے کشمیر کے تاریخی معاشی اور تہذیبی ارتقا کا جائزہ ہندستان کی عام تاریخ کے پس منظر میں لیا ہے۔

کتاب میں کشمیر کی دستکاریوں، چوب تراشی، شال بافی، نقرہ کاری وغیرہ کو خاصی اہمیت دی گئی ہے۔

کشمیر کے قدیم کلچر سے متعلق ابواب بہت دلچسپ ہیں۔ اس کے ایسے نمائندے جیسے کہ دیو چرک اور ترہری اور کہیسٹ ناگارجن دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ کتاب میں کشمیر کے ادب خصوصاً دورِ جدید کے ادب پر بھی زور دیا گیا ہے۔ یہ کتاب عام قاری اور مستشرقین کے لئے یکساں دلچسپی کا باعث ہوگی۔

دنیا کی زبانوں کی ادبی انسائیکلو پیڈیا

ماسکو (تاس)۔ امسال ماسکو سے ادبی انسائیکلو پیڈیا کی جلدیں شائع ہونا شروع ہو جائیں گی۔ زمانہ قدیم سے لے کر آج تک دنیا کے تمام ملکوں کے ادب کے ارتقا پر اس انسائیکلو پیڈیا میں ۱۵ ہزار اندراجات شامل ہیں۔ اس انسائیکلو پیڈیا کی ۷ جلدوں میں ادیبوں، شاعروں اور ڈرامہ نگاروں کے حالات زندگی، مختلف قوموں کے ادب پر تبصرے ادبی مدرسوں اور رجحانات پر مضامین اور تنقید کے ارتقا پر مقالے شامل ہوں گے۔ روس کے کلاسیکی اور سوویت دور کے ادب اور سوویت یونین کی مختلف قوموں کے ادب کے لئے کافی جگہ رکھی گئی ہے۔ یورپ اور شمالی امریکہ کے ادیبوں کے علاوہ لاطینی امریکہ افریقہ اور مشرقی ممالک کے ادیبوں پر مضامین شامل ہیں۔ دنیا کی تمام ادبی زبانوں اور ماہر لسانیات پر بھی مضامین شامل کئے گئے ہیں۔

منٹو کے افسانے کا انگریزی ترجمہ

امریکہ کے ایک ناشر نے مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کے مشہور مصنفین کے افسانوں کا ایک مجموعہ ترتیب دیا ہے جس میں سعادت حسن منٹو کے ایک افسانہ کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ اعلیٰ پایہ کی کتابوں کے سستے اڈیشن شائع کرنے والی فرم نیو امریکن لائبریری کی اس سلسلے کی پہلی کتاب میں جسے ڈینیل امریکن اور ولیم کلفرڈ نے ترتیب دیا ہے۔ منٹو کے علاوہ ایران کے صادق ہدایت، ہندی کے پریم چند، مراٹھی کے وِنکٹیش ملگر، ملایالم کے وداسن، تامل کے راج گوپال آچاری، بنگالی کے تاراشنکر بنرجی اور مانک بندیوپادھیے اور انگریزی کے ہندستانی مصنفین آر کے نراین اور خوشونت سنگھ کے افسانے شامل ہیں۔

ٹیگور کی بارہ کتابوں کا ترجمہ پنجابی میں

ٹیگور کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر پنجاب پردیش کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ ٹیگور کی بارہ کتابوں کا ترجمہ پنجابی میں کیا جائے۔ ترجمہ کا اہتمام پنجابی ساہتیہ اکیڈمی بھائی جودھ سنگھ کی نگرانی میں کریگی۔ تین کتابوں کا ترجمہ ہو چکا ہے باقی کتابوں کا ترجمہ بھی اس سال کے اندر اندر ہو جائے گا۔

امرتا پریتم کی تاجکی ادیبوں سے ملاقات

ہندستان کی مشہور و معروف پنجابی شاعرہ امرتا پریتم سوویت یونین آئی ہوئی ہیں۔ وہ سوویت یونین کے ادیبوں کی یونین اور افریشیائی یکجہتی کمیٹی کی مہمان ہیں انھوں نے ۶ مئی کو تاجکستان کے ادیبوں اور صحافیوں سے ملاقات کی۔ ہندستانی شاعرہ نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ امن اور ترقی کی جد و جہد میں ہمارے مشترکہ مقاصد اور نصب العین کا اظہار ہوتا ہے۔ مذہب یا قوم کے اختلافات ہماری دوستی میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتے۔ مرزا ترسون زادے باقی رحیم زادے اور عبدالسلام دہوتی نے اپنے اشعار سنائے۔ ان شعرا کے بعد امرتا پریتم نے اپنی نظمیں سنائیں جو بہت پسند کی گئیں۔

حصہ نظم

باسط بھوپالی

غزل

چھیڑتا ہے سازِ غم پر دل کا افسانہ مجھے
زہر پیتا ہے بیادِ چشمِ جانانہ مجھے

جل رہا ہوں شمع کی صورت بگریہ اشک و آہ
مل گئی ہے فطرتِ خاموشیِ پروانہ مجھے

ڈھونڈتا پھرتا ہوں کب سے ہر تضاد دہر میں
وہ حقیقت جو بنائے اپنا افسانہ مجھے

میں تو اپنے ذوقِ عصیاں کو مکمل کر چکا
دیکھنا ہے اب تری شانِ کریمانہ مجھے

میرے دل سے کوئی پوچھے کس قدر محبوب ہے
میرا غم خانہ مجھے میرا سیہ خانہ مجھے

تم بھی دیوانہ اگر سمجھو تو دیوانہ سہی
یوں تو کہنے کو سبھی کہتے ہیں دیوانہ مجھے

خود ستا و خود پرست و خود نما و خود نگر
جو بنا دے میری طبع خود فریبانہ مجھے

اب تو ہر کوئی سنا سکتا ہے اپنے نام سے
اک ذرا مضموں بدل کر میرا افسانہ مجھے

ہو سکے شاید مری دیوانگی کا کچھ علاج
کوئی مل جائے اگر مجھسا ہی دیوانہ مجھے

جو ستا پھرتا ہوں مستی میں ہر اک بیکش کے ہاتھ
رقص میں رکھتا ہے اپنے ساتھ پیمانہ مجھے

بھول سکتا ہوں کہیں باسط وہ ساقی کی نگاہ
کر گئی جو مطلعِ انوارِ میخانہ مجھے

کیلاش ماہر

قطعات

حسنِ پُر کیف کا معصوم تصور لے کر
جیسے اک خوابِ پریشاں سے محبت کی ہے!
زیست کی تلخ حقیقت کو سمجھنے کے لئے
میں نے خود گردشِ دوراں سے محبت کی ہے!

خیال و فکر کی سرحد سے بھی بہت آگے
سکون چھوٹ رہا ہے شفق کی چھاؤں سے!
وہ ذکرِ محبت ہے کیا کروں ماہر
مجھے پکار رہا ہے کوئی خلاؤں سے!

رئیس بجنوری

قطعہ

دل ہمارا ہے ان دنوں اے دوست
ایسا افسردہ اور ایسا ملول
دوپہر میں ہو جس طرح کوئی
سر جھکائے ہوئے گلاب کا پھول

اطہر نفیس

غزل

ہم بھی بدل گئے تری طرزِ ادا کے ساتھ ساتھ
رنگِ حنا کے ساتھ ساتھ شوخیِ پا کے ساتھ ساتھ

نکہتِ زلف لے اُڑی مثلِ خیال چل پڑی
چلتا ہے کون دیکھئے آج صبا کے ساتھ ساتھ

اتنی جفا طرازیاں، اتنی ستم شعاریاں
تم بھی چلے ہو کچھ قدم اہلِ وفا کے ساتھ ساتھ

وحشتِ دردِ ہجر نے ہم کو جگا جگا دیا
نیند کبھی جو آ گئی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ ساتھ

ہوش اُڑا اُڑا دیئے راہ کے اضطراب نے
نکہتِ گل چلی تو تھی بادِ صبا کے ساتھ ساتھ

ذکاء الدین شایاں

غزل

ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدا پر چھپتی رہی
اُس جانِ آرزو کو وفا پر چھپتی رہی

ایک ایک غم کو اہلِ تمنا چھپا گئے
ایک ایک غم کو چشمِ حیا پر چھپتی رہی

اُس پیکرِ جمال کو پھر آج رات بھر
افسردہ چاندنی کی ردا پر چھپتی رہی

اک مژدہ نشاط لئے وہ ادائے خاص
آوارگانِ غم کا پتا پر چھپتی رہی

سوچ بہار آج چمن میں ہے کیوں اُداس
اُس زلفِ مشکبو کی ہوا پر چھپتی رہی

خود اپنے دل کا راز خود اپنے ہی دل کی بات
غنچوں کو گدگدا کے صبا پر چھپتی رہی

والی آسی

غزل

جن کی خاطر کبھی بدنام تھے ہم آوارہ
آج خود پھرتے ہیں وہ اہلِ ستم آوارہ

ہم نے بھی ترک کیا سلسلۂ عشق مگر
ہو گئے جب سے فقیہانِ حرم آوارہ

کو بکو جن کو لئے پھرتی ہے اب تیری تلاش
اس سے پہلے تو یہی لوگ تھے کم آوارہ

رونقِ راہِ محبت تو بجا ہے یارو
اور اگر لُٹ گئے اس راہ میں ہم آوارہ

کوئی والی کو جو پوچھے تو بتا دو اُس کو
بال اُلجھے ہوئے بادیدۂ نم آوارہ

بسمل بھرت پوری

غزل

جھکا ئیں سر بھی کیسے آستاں پر
زمیں پر ہم ہیں وہ ہیں آسماں پر

حقیقت میں وہی وہ چھا رہے ہیں
مرے دل پر ہی کیا سارے جہاں پر

خیال آیا ہے دل میں پھر کسی کا
کسی کا نام پھر آیا زباں پر

جو مل جائے تمہارا آستانہ
جھکے کیوں سر کسی کے آستاں پر

یہ کہہ کر سوچ میں بیٹھے ہیں بسمل
ابھی تو نام تھا اُن کا زباں پر

نونہال محبوب

غزل

تیری یادوں کی پھر مہک آئی
پھر چمن میں بہار اٹھلائی

پھول کیا شگفتِ گلشن پر
ہر کلی پھول ہو کے مرجھائی

صحنِ گلشن میں جی نہیں لگتا
جانے کیا دل پہ آج بن آئی

وقت کی دھوپ چھاؤں سہہ سہہ کر
زندگی اور بھی نکھر آئی

آج منزل کی جستجو بھی نہیں
زیست کس موڑ پہ چلی آئی

طور نورانی

غزل

ڈوبنے والے تجھ کو کیا معلوم
کتنی پُر نم یہ چشمِ ساحل ہے

رہروِ شوقِ راہِ اُلفت میں
نقشِ پا اس کا تیری منزل ہے

میرے حُسنِ طلب کی داد تو دے
میرا حُسنِ طلب ترا دل ہے

دیدۂ شوق میں مرے اے دوست
حُسن کا احترام داخل ہے

مراسلات

ذوق کی وفات پر ظفرؔ، تحسینؔ اور فردؔ کے قطعات تاریخ

میرے پاس پرانے کاغذ کے ایک ورق پر ظفرؔ کے تین اور تحسینؔ اور فردؔ کا ایک، یہ پانچ قطعات تاریخ درج ہیں جو استاد ذوقؔ کی وفات پر کہے گئے تھے۔ یہ قطعے شاید اب تک نظر عام پر نہیں آئے ہیں۔ اس لئے ہماری زبان کے ذریعے سے شایع کئے جارہے ہیں:- (سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ)

غم ہیں استاد کے ظفرؔ مجھ کو • نہ رہا شعر و شاعری کا ذوق
کوئی پوچھے گر اس کا سال وفات • کہہ کہ مجموعۂ مکارم ذوقؔ

۱۲۷۱

ششم چار شنبہ بماہ صفر • بحکم خداوند جاں داد ذوق
ظفرؔ روئے اردو بناخن زغم • خراشید و فرمود "استاد ذوقؔ"

۱۲۷۲
۱۲۷۱

اُٹھ جائے جب زمانے سے استاد ذوق ہائے
بار الم سے پشت فلک کیونکے ہو نہ خم
اس درد و غم سے جو دل عالم ہے دردمند
سال وفات بھی ہے ظفرؔ وائے درد و غم

۱۲۷۱

ہائے واویلا و دریغا آج حسان عجم • رخت ہستی باندھ جنت کو گئے با ذوق و شوق
فکر میں تاریخ کی تحسینؔ نے بارنج و الم • ایک نعرہ کھینچا اور کہا "استاد ذوقؔ"

۱۲۷۲
۱۲۷۱

زیں ماتم کہ رفت استاد ے (کذا) • گہر اشک از مژگاں سُفت
فردؔ از راہ سوگواری او • شاعر بے مثال و نامی گفت

۱۲۷۱

آخری قطعے پر شاعر کا نام "حکیم محمد بشارت علی فردؔ" لکھا ہوا ہے۔

تاریخ کلیلہ و دمنہ کی تحقیق

مشہور حکایات کلیلہ و دمنہ یا بیدپائے سلسلے کے مسلم ادب کی تاریخ پر تحقیقی مطالعہ کے سلسلہ میں "ہماری زبان" کے کالموں کے ذریعہ میں کچھ نکات پر ہند و پاک کے علمائے فارسی سے رجوع کرنے کا خواہاں ہوں اور حسب ذیل موضوعات پر اُن سے استفادہ کا خواستگار ہوں۔ براہ کرم ممکنہ تفصیل و حوالوں کے ساتھ ہر موضوع پر اپنی رائے سے درج ذیل پتہ پر ایما فرمائیں۔

(الف) عہد سامانیہ کے اولین (یعنی رودکی کی منظومۂ کلیلہ سے قبل کے) منثور ترجمۂ کلیلۂ نقفع (۱) کا مصنف کون تھا؟ (۲) محرک کون تھا؟ (۳) وجہ تحریک کیا تھی؟ (۴) قریب ترین صحیح عہد تصنیف کیا متعین کیا جاسکتا ہے؟ (۵) کیا وہ ایک باقاعدہ اور مستقل ترجمہ تھا؟ (۶) کیا اس کے "باقیات الصالحات" کسی قدیم معتبر تذکرہ وغیرہ میں دریافت ہوئے ہیں جیسے کہ منظومۂ رودکی کے ان سب نکات پر قدیم ترین یعنی اس عہد کے قریب ترین معتمد راویوں کے حوالے سے بحث فرمائی جائے۔

(ب) کلیلہ و دمنہ کے سلسلے کے فارسی ادب کی مشہور ترین کتاب مولائے الواعظ کی "انوار سہیلی" کے غیر معمولی شہرہ اور قبول عام کی وجہ کیا ہوسکتی ہے۔ اس تعلق سے یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے کہ اس کا پیشرو ترجمہ "کلیلۂ ابوالمعالی" بہت ہی بلیغ، شستہ اور شگفتہ اسلوب تحریر کا حامل تھا اور متاخر ادب پر اس کے گہرے اثرات پڑے، جبکہ "انوار" مولانا کاشفی کے ادعا کے باوجود کافی دقیق انداز نگارش اور مشکل عبارات کا لاطائل مجموعہ ہے، اور اس کی فارسی تخلیص ابوالفضل کی "عیار" سادگی زبان و سلاست بیان کا مرقع ہے۔ ان حقایق کی روشنی میں انوار کی غیر معمولی شہرت و مقبولیت کے پس منظر کے طور پر ان صدیوں کا عوامی ذوق ادب بھی لازماً زیر بحث آنا چاہئے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ انوار نہ صرف کلیلۂ بہرام شاہی اور عیار دانش سے قبول عام کے میدان میں بہت آگے نکل گئی بلکہ اس نے اپنی شہرت و مقبولیت کے آگے خود حسین واعظ کی معرکۃ الآرا شرح کلام پاک کو بھی ماند کردیا۔

(ج) انوار سہیلی کے مختلف السنۂ ہند میں تراجم کی تفصیلات بھی مطلوب ہیں۔ اس تعلق خصوصاً ہماری جامعات کے صدور شعبہ جات فارسی سے عرض ہے کہ وہ ہند و پاک کی اپنے علاقہ کی زبانوں میں اس کے تراجم کے بارے میں ممکنہ معلومات سے ایما فرمائیں یا اس تعلق سے کسی کتاب یا رسالہ کی نشاندہی کریں یا متعلقہ زبان کے کسی فاضل سے متعارف کرادیں۔ انوار کے کئی دلیسی تراجم کا حال اجمالاً کئی جگہ مل جاتا ہے مگر چونکہ فی الفور تاریخ کلیلہ و دمنہ کے سلسلے میں انوار کی عالمگیر قبول و اشاعت کی تاریخ پر علیحدہ مضمون لکھنا ہے اس لئے اس کے ہندوستانی زبانوں کے زیادہ سے زیادہ ترجموں کی تفصیلات جمع کرنا میرے لئے ناگزیر ہے۔

ان تمام نکات کے تعلق سے مندرجہ ذیل پتہ پر عنایت نامے روانہ فرمائے جائیں۔

رائے انیل پرشاد
معرفت ایم غیاث الدین صاحب، انشورنس ایجنٹ
۳۳۔۷۔۴۔۱۱، بازار گھاٹ
پی او خیریت آباد۔ حیدرآباد ۴

غیر مطبوعہ نثری داستانیں کہاں ہیں؟

ہماری زبان کے کسی شمارے میں ایک صاحب کا مراسلہ شایع ہوا تھا کہ اُردو کی غیر مطبوعہ نثری داستانیں کہاں ہیں۔ بعض اہلِ ذوق نے خطوط کے ذریعہ بھی مجھ سے دریافت کر لیا ہے۔ اس لئے یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ جن داستانوں کا ذکر میں نے اپنے مضامین میں کیا ہے ان میں سے اکثر نولکشور بکڈپو کے کتب خانے میں محفوظ ہیں اور وارثان مطبع نولکشور کی ملکیت ہیں۔ ایک داستان "نور نگار" مصنفہ منشی نورالدین علوی کاکوروی کے بعض اجزا جو بطور نمونہ لکھے گئے تھے میں نے دیکھے ہیں اور کامل داستان کاکوری کے کسی صاحب کی ملکیت ہے جس کے متعلق قطعی طور پر میں کچھ نہیں بتا سکتا۔

میں بھی چاہتا ہوں کہ اُردو کا یہ عظیم سرمایہ ضایع نہ ہو اور اس کی اشاعت کا انتظام ہو جائے لیکن موجودہ دَور میں یہ کام کوئی بڑا عوامی ادارہ ہی کر سکتا ہے۔ (سید امیر حسن نورانی)

سنہ ۱۹۱۴ء کے چند اخبارات و رسائل

کام شاستر نامی ایک کتاب میں سنہ ۱۹۱۴ء کے کچھ ایسے اخبارات و رسائل کے نام درج ہیں جنھوں نے اس وقت کے ایک دوا خانے کی مدح سرائی کی تھی۔ وہی فہرست یہاں درج ہے:۔

مفید روزگار، بمبئی۔ دبدبۂ سکندری، رودبار کھنڈ۔ الناظر، لکھنؤ۔ اخبارِ عام روزانہ، لاہور۔ براہمن گزٹ، راولپنڈی۔ پنجاب سماچار، لاہور۔ رفیق الاساتذہ، مدراس۔ رسالہ بیداری، بہرائچ۔ شانتی، راولپنڈی۔ اتحاد روزانہ، بمبئی۔ الحامی، مدراس۔ رسالہ فیاض، جلال پور۔ رسالہ مرقع، شاہجہاں پور۔ کوئٹہ نیوز، کوئٹہ۔ راجپوتانہ گزٹ، اجمیر۔ حق پسند، امرتسر۔ ساوات، الٰہ آباد۔ ست اپدیش، لاہور۔ کان پور گزٹ، کان پور۔ شاہد سخن، حیدرآباد دکن۔ مخبر عالم، مراد آباد۔ سناتن دھرم پرچارک، امرت سر۔ افغان، پشاور۔ نظام الملک، مراد آباد۔

(شعبۂ خبر رسانی، انجمن توسیع اردو)

ذکاء اللہ پر نذیر احمد کا مضمون

رسالہ تمدن کے بارے میں بیدار صاحب جو سلسلۂ مضامین لکھ رہے ہیں، وہ دل چسپ ہونے کے علاوہ مفید بھی ہے۔ ۱۵ مئی سنہ ۶۱ء کے پرچے میں انھوں نے مولوی نذیر احمد کا وہ مضمون دیا ہے جو مولوی ذکاء اللہ پر لکھا گیا تھا۔ اس کے بارے میں قدرے صراحت کی ضرورت ہے۔ یہ مضمون "تمدن" کے لئے نہیں لکھا گیا تھا بلکہ یہ لکھا گیا تھا بطور تقریظ کے استادی اینڈ ریوز کی کتاب "ذکاء اللہ آف دہلی" کے لئے۔ اسے خواہ تقریظ کہئے خواہ دیباچہ، بہر حال مولوی صاحب نے ذکاء اللہ صاحب کے بارے میں وہ باتیں لکھ دی ہیں جو صرف وہی لکھ سکتے تھے۔ اس دیباچہ کے آخری حصّہ میں انھوں نے اینڈ ریوز کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ دیباچہ ان چند تحریروں میں سے ہے جو مولوی نذیر احمد نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل لکھی تھیں اور اس لئے ان کی ادبی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ میری کتاب تذکرہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی میں یہ دیباچہ تمام و کمال موجود ہے۔ (ضیاء الدین احمد برنی)

ایک گذارش

میں علی گڑھ یونیورسٹی سے پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی پر کام کر رہا ہوں۔ مجھے کیفی کی مندرجہ ذیل کتابوں کی ضرورت ہے۔ جن حضرات کے پاس یہ کتابیں موجود ہوں براہِ کرم ان کی قیمت سے مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔

(۱) عورت اور اس کی تعلیم۔ (۲) علاج شمسی۔
(۳) چراغ ہدایت۔ (۴) پریم دیوی۔ (۵) مراری دادا۔
(۶) نتھیا رانا۔ (۷) رہنمائے سالک۔

(ظہور الحسن محلہ قانون گویان علی گڑھ)

انجمن کا خبر نامہ

انجمن کے نئے ممبر

انجمن ترقی اُردو ہند کی مجلس عام میں جو آٹھ جگہیں خالی ہوئی تھیں ان کے لئے قاعدے کی رو سے انتخاب کے پرچے جاری کئے گئے تھے جن کا شمار مجلس عاملہ نے ۱۰ جون کے جلسے میں کیا اور حسب ذیل آٹھ اشخاص کے انتخاب کا اعلان کیا۔

ڈاکٹر تاراچند۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ۔ سید احتشام حسین۔ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ بیگم انیس قدوائی، محمد ایوب۔ پنڈت آنند نرائن مُلّا۔

ان کے علاوہ صدر نے حسب ذیل دو اشخاص کو مجلس عام کا ممبر نامزد کیا ہے:-

الطاف احمد خیری، امتیاز علی عرشی۔

(آل احمد سرور۔ جنرل سکریٹری)
۱۰ جون سنہ ۱۹۶۱ء

اُردو تعلیمی جائزہ

انجمن ترقی اُردو لکھنؤ نے لکھنؤ کارپوریشن کے تحت چلنے والے تمام بیسک اسکولوں میں اُردو تعلیمی جائزہ کی مہم شروع کی ہے۔ اس مہم میں ابھی تک اکیاون اسکولوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان میں دو اسکول پرائیویٹ ہیں، ان کو نکال کر ۴۹ اسکول کارپوریشن کے ہیں، جن میں تین اسکول لڑکیوں کے بھی شامل ہیں۔ ان اسکولوں میں حسب تفصیل ذیل طلبہ کی تعداد ہے۔ یہ تعداد پہلے درجہ سے پانچویں درجہ تک کی ہے۔

	لڑکے	لڑکیاں	کل
ہندو	۵۶۲۹	۲۸۲	۵۹۱۱
مسلم	۲۱۱۶	۷۶	۲۱۹۲
دیگر	۱۷۴	۲۴۵	۴۱۹
میزان	۷۹۱۹	۶۰۳	۸۵۲۲
ایسے طلبہ جن کی مادری زبان ہندی لکھی ہے	۶۷۲۰	۶۰۳	۷۳۲۳
〃 〃 〃 اُردو 〃 〃	۱۱۹۹	×	۱۱۹۹
ایسے طلبہ جن کا ذریعہ تعلیم ہندی ہے	۷۳۶۶	۶۰۳	۷۹۶۹
〃 〃 〃 اُردو 〃	۵۵۳	×	۵۵۳

ان اعداد و شمار سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ لکھنؤ جیسے اُردو کے مرکز اور گہوارے میں کس بیدردی کے ساتھ اس کو ختم کیا جا رہا ہے۔ یہ سنہ ۱۹۶۱ء کے حالات ہیں۔ اس سے قبل تو کسی اسکول میں بھی "اُردو" کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ جن طلبہ کی مادری زبان "اُردو" لکھی ہوئی تھی تعلیم کے جمہوریت پسند، منصف مزاج اور دیش بھگت ذمہ داروں نے "اُردو" کاٹ کر "ہندی" لکھ دی۔ یہ عوامل اور اثرات اب بھی کام کر رہے ہیں۔ اب بھی اُردو والوں کی مادری زبان "ہندی" لکھی جا رہی ہے۔ اب بھی ان کی تعلیم کا انتظام نہیں ہے۔ اب بھی ان کے لئے ہزاروں دقتیں اور رکاوٹیں موجود ہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے جیسا کہ ہمارے اکثر دیش بھگت اور جمہوریت نواز فرما رہے ہیں تو بھی کم از کم ۲۱۹۲ لڑکوں اور لڑکیوں کی مادری زبان اُردو ہونا چاہئے لیکن صرف ۱۱۹۹ لڑکوں کی مادری زبان اُردو لکھی ہے اور لڑکیوں کی ہندی۔ دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ جب ۱۱۹۹ لڑکوں کی مادری زبان اُردو ہے تو ان کو تعلیم کیوں نہیں دی جاتی۔ صرف ۵۵۳ لڑکوں کو تعلیم دینا کیا معنی رکھتا ہے؟ اس طرح صرف مسلم لڑکوں میں تقریباً ۲۵ فیصدی طلبہ کو اُردو تعلیم دی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ اور جن لڑکوں کی مادری زبان اُردو ہے ان میں ہندو، سکھ، عیسائی سب کے لڑکے شامل ہیں ان کی بھی تعداد کم نہیں ہے لیکن کسی ایک کو بھی اُردو نہیں پڑھائی جاتی ہے۔ ابھی لکھنؤ کے تمام اسکولوں کے اعداد و شمار نہیں آئے ہیں۔ مگر موجودہ اعداد و شمار سے اُردو کے متعلق جو نتیجہ نکلا ہے قریب قریب بقیہ اسکولوں میں بھی یہی حال ہوگا۔

اس جائزہ سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ ابھی تک ایسے اساتذہ موجود ہیں جو دونوں زبانوں کی تعلیم دے سکتے ہیں لیکن ان کی تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے کیونکہ اب ٹریننگ میں یہ شرط نہیں رہی کہ امیدوار دونوں زبانیں اُردو اور ہندی جانتے ہوں بلکہ اُردو جاننا اب "نااہلیت" سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے اس کا انتخاب نہیں کیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں طلبہ کے سرپرستوں کا سب سے زیادہ قصور ہے۔ وہ اتنے زیادہ بے حس اور اپنی مادری زبان اُردو کی طرف سے غافل ہو گئے ہیں کہ وہ خود اپنے ہاتھوں نہ صرف زبان کا گلا گھونٹ رہے ہیں بلکہ اپنے بچوں کی ذہنی و دماغی صلاحیتوں کو بھی ختم کر رہے ہیں اور ان کے مستقبل کو سب سے بدتر کرتے جا رہے ہیں۔ دنیا کے تمام ماہرین تعلیم کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ بچے کو اسکی مادری زبان میں تمام مضامین پڑھائے جائیں جو بچے ایسی تعلیم سے محروم رہتے ہیں وہ ترقی نہیں کر سکتے۔ اس لئے جو سرپرست اپنے بچوں کی تعلیم "غیر مادری زبان" میں دلا رہے ہیں وہ بچوں کے ذہن و دماغ کو مفلوج کر رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اُردو کی تعلیم میں طرح طرح کی غیر آئینی، غیر اخلاقی، غیر جمہوری رکاوٹیں ہیں، یہ بھی حقیقت ہے کہ اُردو کشی ملک کی بڑی خدمت سمجھی جاتی رہی ہے اور اس میں ہمارے بڑے سے بڑے "راج رشی" "نیتا" اور "دیش بھگت" ہم خیال رہے ہیں۔ یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ قاتلانِ اُردو پر انعامات و اعزازات کی بارش کی گئی اور پرستارانِ اُردو کو غدار اور پھانسی کا حقدار سمجھا گیا، اور یہ بھی غلط نہیں ہے کہ دستور ہند کی تذلیل و تضحیک کرنے والوں سے کوئی باز پرس نہیں کی جاتی اور جو لوگ اس کی پابندی کرتے ہیں یا اس پر عمل کرنے کیلئے کہتے ہیں انھیں ناقابل معافی مجرم سمجھا جاتا ہے لیکن یہ کیفیت زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکتی، جمہوریت کا استحکام، سامراجیت، تعصب اور آمریت کی موت کا باعث بنے گا، اور ہر قسم کا جبر و ستم، ظلم و زیادتی ختم ہو کر رہے گا۔

اُردو کے نام لیواؤں کو ہمت و حوصلے سے کام لینا چاہئے، اپنے حقوق کی خود حفاظت کرنا چاہئے اور اپنے بچوں کو مادری زبان پڑھانے کے لئے باقاعدہ منظم اور مسلسل کوشش کرتے رہنا چاہئے۔ یہ ان کی کوشش ہی کا نتیجہ ہے کہ بیسک تعلیم صفر سے بڑھ کر ساڑھے پانچ سو ہو گئی۔ اگر ان کی یہ جدوجہد جاری رہی تو کوئی وجہ نہیں کہ ساڑھے پانچسو ساڑھے پانچ ہزار یا ساڑھے پانچ لاکھ نہ ہو جائیں۔ اور پہلے کی طرح ہر بچے کو اُردو میں جملہ مضامین نہ پڑھائے جانے لگیں؟

جولائی قریب ہے۔ یہی وقت ہے کہ ہر ہمدرد اُردو، ہر خادم قوم و ہمدرد ملک اپنے اپنے حلقوں میں اس بات کا جائزہ لیں کہ کتنے طلبہ اُردو تعلیم سے محروم ہیں۔ ان کے قریب کے بیسک اسکول میں اُردو تعلیم دی جاتی ہے یا نہیں؟ اس اسکول میں اُردو کے طلبہ کی کتنی تعداد ہے؟ اُردو کے اساتذہ ہیں یا نہیں؟ اگر ذرا سی بھی توجہ اور کوشش کی جائے گی تو ہر اسکول میں اُردو تعلیم جاری ہو جائے گی۔ (شجاعت علی سندیلوی - جنرل سکریٹری)

لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو پروفیسر کے تقرر کا مطالبہ

لکھنؤ - ۲۸ مئی سنہ ۱۹۶۱ء، شعبۂ فارسی و اُردو لکھنؤ یونیورسٹی کے طلبہ کا ایک جلسہ آفتاب اختر کی صدارت میں ہوا جس میں حسب ذیل تجویز متفقہ طور پر منظور کی گئی۔

"یہ جلسہ اس بات پر اظہارِ مسرت کرتا ہے کہ حکومت اترپردیش اور وزیر اعلیٰ کی طرف سے اُردو زبان کی ترقی اشاعت اور اسے صوبہ میں جائز مقام دینے کا بار بار اعلان کیا گیا ہے، اور گزشتہ برسوں میں اس کی ترقی میں جو رکاوٹیں تھیں انھیں دور کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ ہندی کے بعد صوبہ اترپردیش میں اُردو ہی صدیوں سے اہم زبان کی حیثیت سے مانی جاتی رہی ہے اور لکھنؤ اس کا سب سے اہم مرکز رہا ہے۔ لیکن یہ ایک قابل افسوس بات ہے کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو کے ساتھ مناسب برتاؤ نہیں کیا جارہا ہے صوبہ اترپردیش کی تقریباً سبھی یونیورسٹیوں میں شعبۂ اُردو میں پروفیسر شپ موجود ہے۔ اس میں تحقیقی کاموں کے لئے مالی امداد دی جاتی ہے اور جن طلبہ کی مادری زبان اُردو نہیں ہے ان کے لئے ڈپلوما کورس کی تعلیم کا انتظام بھی ہے لیکن لکھنؤ یونیورسٹی میں نہ تو پروفیسر شپ ہے اور نہ اُردو کے ڈپلوما کے درجوں کی تعلیم دی جاتی ہے جس کی وجہ سے عوام اور طلبہ کی نظر میں اس شعبہ کی اہمیت میں کمی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

اُردو ریسرچ اور دوسرے درجوں میں طلبہ کی تعداد میں گذشتہ کئی برسوں سے اضافہ ہوتا جارہا ہے اور اسی کے پیش نظر لکھنؤ یونیورسٹی کی ایگزیکٹیو کمیٹی نے گذشتہ سال شعبۂ فارسی اُردو میں پروفیسر شپ کے قیام کا فیصلہ کیا لیکن چونکہ حکومت نے ابھی تک اس کے قیام کی منظوری نہیں دی ہے اس لئے اس پر عمل نہیں ہوسکا۔

ہم حکومت اترپردیش اور وزیر اعلیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ شعبہ میں پروفیسر شپ کی منظوری کے لئے جلد کوئی قدم اٹھایا جائے تاکہ اُردو سے دلچسپی رکھنے والے عوام کو یہ احساس ہوسکے کہ وزیر اعلیٰ کی ہمدردیوں کے تحت اس زبان کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک نہیں کیا جائے گا۔"

اس جلسہ میں ایک کمیٹی بنائی گئی جو رائے عامہ کو ہموار کرے گی اور وزیر اعلیٰ، وزیر تعلیم اور وائس چانسلر سے اس سلسلے میں ملاقات کرے گی۔ کمیٹی کا کنوینر شاذب ردولوی کو منتخب کیا گیا ہے۔

انجمن ترقی اُردو (کلکتہ) کے نئے عہدیداروں کا انتخاب

۳۰ مئی کی شام کو انجمن ترقی اُردو کلکتہ کی نئی مجلس عاملہ کا پہلا جلسہ زیر صدارت صدر منتخب ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی منعقد ہوا، جس میں مندرجہ ذیل عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

نائبین صدر: جناب سالک لکھنوی، جناب سید امیر رضا کاظمی، جناب احمد سعید ملیح آبادی۔ خازن: جناب علی احمد صدیقی۔

جنرل سکریٹری: جناب ایم۔ اے۔ مجید۔ نائب سکریٹری: جناب غلام قادر خاں، جناب علقمہ شبلی۔ پبلسٹی سکریٹری: محمد ادریس الحق۔

اس جلسہ میں مندرجہ ذیل کمیٹیوں کی بھی تشکیل ہوئی جو انجمن کے مختلف کاموں کی ذمہ دار ہوں گی۔ مالیاتی کمیٹی، اعداد و شمار کمیٹی، ادبی کمیٹی، تعلیمی کمیٹی، ممبر سازی کمیٹی۔

جلسہ میں یہ بھی طے پایا کہ انجمن درسی اور دیگر کتابوں کے شائع کرانے کی اسکیم تیار کرکے آئندہ جلسہ میں پیش کرے۔

(محمد ادریس الحق پبلسٹی سکریٹری)

سیکر (راجستھان) میں اُردو کے لئے جدوجہد

انجمن ترقی اُردو سیکر کا ایک وفد مورخہ ۱۳ مئی سنہ ۱۹۶۱ء کو جناب ایس۔ سی۔ ماتھر صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر آف ایجوکیشن راجستھان سے ملا اور ضلع سیکر کے پرائمری اسکولوں میں جہاں جہاں اُردو پڑھنے والوں کی کافی تعداد ہوتے ہوئے بھی اُردو کے اجراء کرنے میں جس پس و پیش سے کام لیا گیا ہے اس پر احتجاج کیا گیا اور موصوف کو بتایا گیا کہ کس طرح اُردو پڑھنے والوں کے سامنے غیر ضروری رکاوٹیں لائی جاتی ہیں۔

ڈائرکٹر صاحب موصوف نے تمام شکایات کو دلچسپی سے سنا اور اراکین وفد کو یقین دلایا کہ وہ اس معاملے میں پوری دلچسپی سے حصہ لیں گے اور ان شکایتوں کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ تمام شکایات انھیں یادداشت کے طور پر پیش کردی گئی ہیں، اور انجمن کو قوی امید ہے کہ جولائی سنہ ۱۹۶۱ء سے شروع ہونے والے سیشن سے اُردو پڑھنے والوں کے لئے اُردو داں مدرسین کا انتظام ہوگا، اور اُردو پرائمری کلاسوں سے لے کر ڈگری کالج تک برابر جاری رہے گی۔ انجمن ایسی توقع رکھتی ہے۔ اس وفد میں تین حضرات شامل تھے۔

(۱) ماسٹر خورشید احمد سکریٹری، (۲) مسٹر یٰسین علی ممبر (۳) مسٹر محمد صدیق بی اے

(خورشید احمد سکریٹری)

مجلس مناظمہ مدراس کی بارھویں نشست

۲۱ مئی ۶۱ء اتوار کی شام ۴ بجے مولانا یوسف کوکن کے دولت کدہ پر جناب عبدالغفار شاکر فوقی نے مناظمہ کی بارھویں نشست کا اہتمام کیا۔ پُرتکلف چائے کے بعد مولانا سید عظمت اللہ سروری کی صدارت میں جلسے کا آغاز ہوا۔ صدر موصوف نے مجلس مناظمہ کی مختلف نشستوں اور سال بھر کی کارروائیوں کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ اب تک مجلس نے نظم کے فروغ اور نظم نگاری کے رجحان کو آگے بڑھانے میں کافی خدمت انجام دی ہے۔ وہ ارباب سخن بھی جو صرف گیسوئے غزل کی مشاطگی میں مصروف تھے نظم کی طرف متوجہ ہوئے۔ آخر میں شعراء سے یہ گزارش کی کہ ہر نشست میں اپنی تازہ اور نئی تخلیقات سے محظوظ فرمائیں۔ جن شعراء نے اس نشست میں اپنی نظمیں سنائیں ان میں عبدالباری جاوی، حیدر علی خاں حمید، ڈاکٹر عزیز تمنائی، امین احمد پاشا، احمد امجد، عبدالغفار شاکر فوقی، دانش فرازی کے نام قابل ذکر ہیں۔ عزیز تمنائی نے دانش فرازی کی نظم تضاد پر مختلف ناقدین کا تجزیہ اور تبصرہ اور خود شاعر کی تشریح پیش کی۔ ناقدین کا نام صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ تجزیہ چونکہ اس نئے سلسلے نے محفل میں خاصی دلچسپی پیدا کردی۔ اس مفید و صحت بخش اقدام کو مستحسن کہا گیا۔

فلم اور ادب

راجندر سنگھ بیدی سے ایک ملاقات

فلمی دنیا بھی بڑی عجیب دنیا ہے۔ دور سے چمکتی ہوئی نظر آنے والی اس دنیا کو قریب جاکر دیکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ وہ سونا نہیں۔ بھیڑ بھی "ہر چیز کہ کان نمک رفت نمک شد" کے مصداق وہاں جو بھی جاتا ہے اسی رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ ہمارے اچھے ادیبوں اور دانشوروں کے اب تک فلمی دنیا سے دور رہنے کی شاید یہی وجہ ہے۔ چنانچہ آج بھی فلمی دنیا میں باشعور، ذہین اور فن کی خدمت کا جذبہ رکھنے والے ادیبوں اور فنکاروں کی تعداد آٹے میں نمک سے زیادہ نہیں۔ راجندر سنگھ بیدی بھی انہی میں سے ایک ہیں۔ اپنے قلم کے زور سے ادب کی دنیا میں ہل چل مچا دینے اور دلوں کو فتح کر لینے کے بعد جب وہ فلمی دنیا میں پہنچے تو وہاں بھی انھوں نے اپنے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھا اور "نمک کی کان" میں جاکر "نمک" بننے سے احتراز کیا۔ ایسے ادیب اور فن کار سے ملاقات کے دوران میں ظاہر ہے کہ بات چیت کا رُخ فلموں کی طرف ہو جانا یقینی اور فطری ہے چنانچہ بیدی صاحب سے پہلا سوال فلم اور ادب کے رشتے کے متعلق ہی کیا۔

بیدی صاحب نے جو اپنے سنجیدہ اور گمبھیر افسانوں کے برعکس بڑی مزیدار اور چٹپٹی باتیں کرتے ہیں، اس سوال کا جواب بڑے دلچسپ انداز میں دیا۔ انھوں نے کہا کہ ایک باپ کی اولاد لڑکا اور لڑکی ہوتے ہیں۔ لیکن لڑکے پہ باپ زیادہ توجہ نہیں کرتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنا راستہ بنا لے گا مگر لڑکی پہ وہ زیادہ توجہ کرتا ہے اسکی تربیت پر پوری توانائی صرف کرتا ہے تاکہ جب وہ دوسرے کے گھر جائے تو اسے قبول کر لیا جائے یہی حال ادب اور فلم کا بھی ہے۔ فلم ایک لڑکی ہے اور جب تک اسے بنا سنوار کر پیش نہ کیا جائے اُس کی بیٹریا۔ ڈسٹری بیوٹر اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا اسکے علاوہ فلم کے بہت سارے فنی پہلو بھی ہوتے ہیں۔ جس میں فوٹو گرافی، صدا بندی وغیرہ شامل ہیں۔ ادب کے لئے ان چیزوں کی ضرورت نہیں کیونکہ ادیب جب لکھتا ہے تو وہ اپنی چیز کسی ناشر کے ہاتھوں فروخت کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے فن کے تقاضے سے مجبور ہو کر لکھتا ہے لیکن فلم اس لئے بنائی جاتی ہے کہ اسے ڈسٹری بیوٹر حاصل کرے اور زیادہ سے زیادہ لوگ دیکھیں یہی وجہ ہے کہ فلم کو بنانے سنوارنے پر بہت زیادہ توجہ دینی پڑتی ہے۔ لیکن بنیادی طور پر یہ بات درست ہے کہ ادب ہی فلم کا منبع بھی ہے۔ ادب ہی کی بنیاد پر فلم کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ اور جب یہ عمارت کھڑی ہو جاتی ہے تو ادب اور فلم اظہار کے دو مختلف ذریعے (FORMS OF EXPRESSION) بن جاتے ہیں۔ جن کے اثرات اور ردعمل مختلف ہوتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ فلمیں زیادہ سے زیادہ عوام تک پہنچتی ہیں اور ان کا اثر بھی ادب کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ اثر ادب کی طرح دیرپا نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی اچھی فلم بن جائے تو اسے دیکھ لیا جاتا ہے اس کی تعریفیں کی جاتی ہیں اور پھر دو چار، آٹھ دس برس بعد اسے فراموش کر دیا جاتا ہے لیکن ایک عظیم ادبی تخلیق صدہا برس گزر جانے کے بعد بھی اتنی ہی عظیم رہتی ہے اور اس کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

فلموں اور زبان کے مسئلے میں بظاہر کوئی تعلق نہیں۔ لیکن بیدی صاحب نے اس بارے میں جو خیالات ظاہر کئے ان سے پتہ چلتا ہے کہ فلمیں ہماری زبان کے مسئلے کو حل کرنے میں بھی بڑی مدد دے سکتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جو فلمیں بنتی ہیں اور جنھیں ہزاروں تماشائی بڑے شوق سے دیکھتے ہیں اُن کی زبان نہ اُردو ہوتی ہے نہ ہندی بلکہ عام فہم زبان ہوتی ہے جس میں ان دونوں زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے ہیں اس طرح غیر شعوری طور پر ایک زبان تیار ہو رہی ہے جسے بغیر کسی اعتراض کے فلمساز بھی قبول کرتے ہیں اور تماشائی بھی اس سوال پر کہ سنسر بورڈ اُردو کی فلموں کو بھی ہندی کے سرٹیفکٹ کیوں دیتا ہے؟ بیدی صاحب نے بتایا کہ اس کا انحصار کچھ تو پروڈیوسرز پر ہے اور کچھ سنسر بورڈ پر چنانچہ جب کچھ فلمسازوں نے اُردو کا سرٹیفکٹ دینے پر اصرار کیا جسے قبول کر لیا گیا۔ فلمی دنیا سے غیر متعلق شعراء اور ادیبوں کی تخلیقات کو فلموں کے لئے استعمال کرنے کا ذکر کرتے ہوئے بیدی صاحب نے کہا کہ اگر پہلے کی لکھی ہوئی چیزیں فلم کی (SITUATION) کے مطابق ہوں اور ضروریات کی تکمیل کرتی ہوں تو انھیں قبول کر لیا جاتا ہے اس سلسلے میں انھوں نے بل راج کی فلم "اس نے کہا تھا" کے لئے مخدوم محی الدین کی نظم "جانے والے سپاہی سے پوچھو..... کا ذکر کیا اور بتایا کہ خود انھوں نے اپنی زیر تکمیل فلم "رنگولی" کے لئے موسیقار شنکر جے کشن سے بہادر شاہ ظفر کی ایک غزل "بھلا مانو برا مانو" کا ٹکڑا استعمال کرنے کی خواہش کی چونکہ یہ ٹکڑا موسیقیت اور فلمی ضرورت کے اعتبار سے بھی موزوں تھا اس لئے شنکر جے کشن نے اس تجویز کو فوراً قبول کر لیا۔

اسٹار سسٹم اور باکس آفس پر فلم کو کامیاب بنانے کا رجحان ہماری صنعت فلم سازی کی بہت بڑی لعنتیں ہیں، ان کو دور کرنے کے متعلق بیدی صاحب نے کہا کہ اس کا تعلق بڑی حد تک ہمارے سماجی، سیاسی اور معاشی نظام سے ہے، ہماری فلمی صنعت سے وابستہ لوگ اتنے باشعور نہیں وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کی فلم کامیاب ہو اور ان کا لگایا ہوا سرمایہ واپس مل جائے۔ اس کے لئے وہ صرف بڑے بڑے اداکاروں کو ہی اپنی فلم میں پیش کرنے پر اصرار کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا فلم بین طبقہ بھی صرف چند اداکاروں کی فلمیں دیکھنا پسند کرتا ہے خواہ وہ فلم کیسی ہی ردی کیوں نہ ہو اس سلسلے میں فلم ساز کچھ پیش قدمی کر سکتا ہے اور تماشائیوں کی کچھ رہنمائی کر سکتا ہے لیکن اگر وہ ان باتوں کو بالکل نظر انداز کرکے فلم بنائے تو پھر اس کی فلم چلے گی نہیں اور دوسری فلم بنانے کے لئے اس کے پاس سرمایہ نہیں رہے گا۔ ان حالات میں اسٹار سسٹم کو ختم کرنے میں تماشائیوں پر بھی کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور یہی وجہ ہندوستانی فلموں کا معیار پست ہونے کی بھی ہے چونکہ اسٹار سسٹم جیسی بندشوں میں جکڑا ہوا ہوتا ہے اور ذاتی طور پر بھی وہ فلموں کا معیار بلند کرنے سے زیادہ سرمایہ حاصل کرنے سے دلچسپی رکھتا ہے اس لئے ہماری فلموں کا معیار بلند نہیں ہونے پاتا۔ (بشکریہ سیاست)

"ہماری زبان" میں اشاعت کے لئے مضامین نظم و نثر بھیجتے وقت اس کا خیال رکھئے کہ وہ غیر مطبوعہ اور مختصر ہوں۔ ادارہ

احراز نقوی

پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناول

ابھی کچھ عرصہ ہوا ۸ مارچ ۱۹۶۱ء کو "ہماری زبان" سے ایک چھوٹا سا مضمون نما استفسار یہ ڈاکٹر قمر رئیس کا طبع ہوا تھا جس میں "چنچل نار" کے مصنف پر ایک بڑی توجہ طلب بحث چھیڑی ہے۔ اب تک ہمارے مطالعہ میں یہی آتا رہا کہ یہ تصنیف سرشار ہی کی ہے۔ اور سب سے پہلے اس کی توثیق چکبست اور راوتار لعل بقایا نے کی تھی اسکے توسل سے ہمارے نقاد اس تصنیف کو سرشار سے منسوب کرتے رہے۔ نصیرالدین ہاشمی کا بصیرت افروز انکشاف تصدیق کرتا ہے کہ یہ ناول سرکشن پرشاد شاد کا ہے اس تصدیق کے باوجود بہت سے شبہات اور تجسسات پیدا ہوتے ہیں جس کا جواز تحقیق اور تنقید کا محتاج ہے۔

مارچ سنہ ۱۹۶۱ء کے ماہنامہ "ہم قلم" میں ایک بہت طویل تنقیدی مضمون "اردو ناول کا آغاز اور ابتدائی نشوونما" کے عنوان سے اختر انصاری کا نظر سے گزرا۔ فاضل نقاد ایک ایسی غلطی کے مرتکب ہوئے جس کی ان جیسے نقد بزرگ سے توقع نہ تھی۔

موصوف نے اپنے تنقیدی مضمون میں ڈپٹی نذیر احمد سے لے کر رسوا تک ناولوں کا ایک تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اور اختلاف سے قطع نظر ایک جگہ رتن ناتھ سرشار کی تصانیف کی فہرست (فسانۂ آزاد کے علاوہ) اس طرح ترتیب دی ہے۔ سیر کہسار۔ رنگے سیار۔ طوفان بدتمیزی۔ بچھڑی دلہن۔ کامنی اور کڑم دھم۔ پہلی غلطی یہ کہ تاریخی تسلسل سے یہ فہرست غلط ہے۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ رنگے سیار نام کا کوئی ناول سرشار کا نہیں ہے۔ اگر فاضل نقاد نے سرشار کے ناولوں کو صرف دیکھنے ہی کی زحمت گوارا فرمائی ہوتی تو شاید اس سہو کا امکان نہ ہوتا۔

ویسے اس غلطی کی کہانی یہ ہے کہ سب سے پہلے رام بابو سکسینہ نے اپنی تاریخ میں رنگے سیار کا نہ جانے کس طرح ذکر کر دیا۔ اختر انصاری نے سرشار کے ناولوں کو بغیر پڑھے ہوئے وہی فہرست نقل کر کے تنقید بھی کر دی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر رنگے سیار کی حقیقت کیا ہے۔ اور حقیقت محض اتنی ہے کہ نول کشور کے مہتمم نے فسانۂ آزاد جلد اول کا پندرہ صفحات کا ایک خلاصہ فسانۂ آزاد کی شہرت کے لئے چھاپ دیا تھا۔ اس کی نوعیت محض کاروباری تھی۔ (میرے نجی کتب خانے میں یہ کتاب موجود ہے)

نول کشور کے مہتمم نے "رنگے سیار" کا نام خود اختراع نہیں کیا تھا بلکہ فسانۂ آزاد جلد اول کا ایک عنوان تھا۔ پہلے سرشار نے اودھ اخبار کے ایک کالم میں یہ ناول لکھنا شروع کیا تھا۔ مختلف معاشرتی، ثقافتی، دینی اور دنیاوی مسائل پر مختلف عنوانات سے اپنے قلم کے جوہر دکھائے مثلاً کچھ عنوانات ملاحظہ فرمایئے:۔
رنگے سیار۔ سحر الدولہ بہادر۔ لکھنؤ کا محرم الحرام۔ تندرستی ہزار نعمت ہے۔ مکتب خانہ۔ بات بات پر چمکنے والی کی ناک کاٹوں۔ چلو میں الو۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب رام بابو کے تسامح کے دو ہی طریقے سمجھ میں آتے ہیں۔ یا تو یہ ہوا کہ بغیر پڑھے ہوئے محض وہ کتابچہ دیکھ کر رنگے سیار کو الگ ناول تسلیم کر لیا یا پھر یہ ہوا کہ نولکشور پریس کی کتابوں کی فہرست اخبارات۔ رسائل اور کتب میں تجارتی نقطۂ نظر سے طبع ہوا کرتی تھیں ان فہرستوں میں رنگے سیار کا نام بھی ہوتا تھا ہو سکتا ہے رام بابو سکسینہ وہیں سے دیکھ کر اس کو الگ ایک ناول سمجھ بیٹھے ہوں۔ اختر انصاری صاحب نے نقل کفر کفر نہ باشد کے قول کو تنقید میں مباح کر لیا۔

رتن ناتھ سرشار کے بارے میں بہت سے نقادوں نے ایسی ہی ریت کو اپنایا ہے۔ اس کے ضخیم اور کثیر ناولوں کا بغیر مطالعہ کئے ہوئے جو کچھ سمجھ میں آتا ہے لکھتے رہتے ہیں یہی بات ہے کہ ہمیشہ سرشار کے فن کے سلسلے میں ہر نقاد کئی باتوں کو الٹ پھیر کر اپنے الفاظ میں دہراتے ہیں اور حد یہ ہے کہ ناولوں کی صحیح ترتیب بھی نہیں لکھ سکتے۔ سرشار کے ناولوں کی ترتیب ملاحظہ فرمایئے۔

فسانۂ آزاد (چار حصے)	تاریخ اشاعت	سنہ ۱۸۸۰ء	مطبوعہ نولکشور پریس
جام سرشار	"	سنہ ۱۸۸۶ء	"
سیر کہسار	"	سنہ ۱۸۹۰ء	"
کامنی	"	سنہ ۱۸۹۴ء	جوبلی پرنٹنگ ورکس لکھنؤ

اور اس کے بعد سرشار نے ڈاکٹر سی سی گھوش کے مطبع جوبلی پرنٹنگ ورکس لکھنؤ سے پانچ چھوٹے ناولوں کا معاہدہ کر لیا۔ یہ پانچ ناولچے "خمکدۂ سرشار" کے نام سے الگ سنہ ۱۸۹۴ء ہی میں طبع ہوئے۔ کچھ لوگوں نے "خمکدۂ سرشار" کو الگ ناول سمجھا ہے وہ بھی غلط ہے۔ اب ان پانچ ناولچوں کی تاریخی ترتیب سے نام ملاحظہ فرمایئے۔ (۱) کڑم دھم — (۲) بچھڑی دلہن — (۳) پی کہاں — (۴) ہشو — (۵) طوفان بے تمیزی — گور غریباں — تاریخ سنہ ۱۸۹۹ء — غیر مطبوعہ۔

برج نرائن چکبست اور راوتار لعل بقایا کے تنقیدی مضامین سے ہمارا قیاس ہے کہ یہ ناول حیدرآباد میں لکھا گیا۔ مگر ہنوز طبع نہ ہو سکا۔

رام بابو سکسینہ نے اپنی تاریخ میں "فسانۂ جدید" کو بھی سرشار کے ناولوں میں شامل کیا ہے۔ وہ بھی غلط ہے محض اس کی حقیقت اتنی ہے کہ جام سرشار کا پہلے نام فسانۂ جدید ہی طے پایا تھا۔ نظر ثانی کے بعد سرشار نے اس کا نام جام سرشار رکھ دیا۔ راقم السطور کو ایک زمانے میں رام بابو کی تاریخ پڑھ کر فسانۂ جدید کی بڑی تلاش اور جستجو رہی۔ مختلف کتب خانوں سے استفسار کے بعد بھی کچھ پتہ نہ چلا۔ پرانے ناولوں کے مطالعے کے سلسلے میں ایک ناول طوفان حیل یونہی نظر سے گزرا۔ کتاب کے شروع میں کچھ ناولوں کے اشتہار نظر آئے۔ جام سرشار پر نظر ٹھہری اور "فسانۂ جدید" کی حقیقت کا سراغ لگ گیا۔ وہ اشتہار ملاحظہ فرمایئے:۔

"جام سرشار۔ بالتصویر، جس کا پہلے نام
فسانۂ جدید تھا بنظر ثانی پنڈت صاحب
موصوف چھپا۔ قیمت ایک روپیہ"
(طوفان حیل صفحہ ۳)

یہ تھا فسانۂ جدید کا راز جس نے رام بابو سکسینہ کو نہ جانے کس طرح گمراہ کر دیا۔ ایسی ہی غلطیاں ادب میں نہ جانے کتنے خطرناک میلان کا سامان مہیا کرتی رہتی ہیں۔

تبصرہ

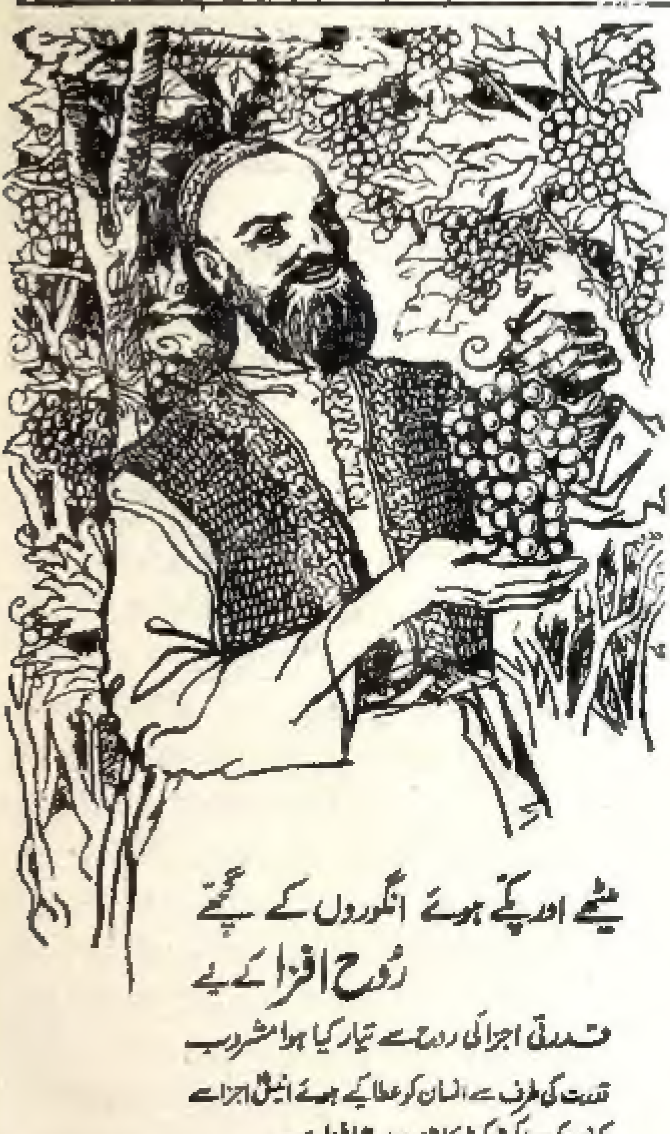
شہریار

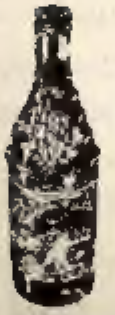
آج کل کا "ٹیگور نمبر"

مرتب : عرش ملسیانی
ضخامت : ۲۰۰ صفحات
قیمت : ایک روپیہ
ملنے کا پتہ : پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سکریٹریٹ دہلی ۶

ٹیگور کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر ماہنامہ "آج کل" دہلی نے ضخامت کے اعتبار سے مختصر لیکن مواد کے اعتبار سے جامع نمبر شایع کیا ہے۔ اس خاص نمبر میں ٹیگور کی عظمت اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر اہم مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون سنت دن کمار داس کے انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے جس میں ٹیگور کی زندگی کے حالات اور اہم واقعات کو دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد محمد اجمل خان کا مضمون "شانتی نکیتن" ہے اس میں "شانتی نکیتن" کے قیام کی مختصر تاریخ، مقاصد اور ملک کے تعلیمی نظام پر اس کے اثرات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ تیسرا مضمون "رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری پر طائرانہ نظر" اردو کے مشہور و مقبول شاعر فراق گورکھپوری کا لکھا ہوا ہے۔ فراق صاحب نے اپنے مخصوص تاثراتی انداز میں ٹیگور کی شاعری کی خصوصیات پر تبصرہ کیا ہے۔ ان مضامین کے علاوہ بی۔ گوپال۔ ریڈی (گرو دیو کے قدموں میں)، ابوالکلام (ٹیگور مصوری)، زہرہ سہگل (ٹیگور کی شاعری اور رقص ڈراما)، سعید انصاری (ٹیگور کا نظریۂ تعلیم)، سچدانند واتسیاین (روشن ضمیر رابندر ناتھ)، ابوالحیات (ٹیگور بحیثیت قوم پرست)، قمر رئیس (ٹیگور کے مختصر افسانے)، شاکر پرشاد کھنّی (مشرق و مغرب۔ ایک مکالمہ)، گھنشیام سیٹھی (ٹیگور۔ ایک ہمہ گیر شخصیت)، فضیل جعفری (ٹیگور کا روحانی نظریہ) اور شانتی دیو گھوش (ٹیگور بہ حیثیت موسیقار) کے مضامین شامل ہیں۔

فراق گورکھپوری کے منثور ترجمے اور مضمون "تمہیں کا مضمون" اور ٹیگور کی تصویریں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ایڈیٹر نے اس نمبر کی ترتیب میں جس خوش مذاقی اور سلیقہ کا ثبوت دیا ہے اس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔





پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شایع کیا